مولانا یاسر احمد زیرک *

امام بخاریؒ کے تعلیمی نظریات سے قدیم وجدید ماہرین تعلیم کا اتفاق

(حصہ اول)

علم کا حصول اگرچہ مسلسل عمل اور نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے یعنی مہد سے لحد تک۔ اس لیے اہل علم کی ایک اہم اور بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ حاصل شدہ علم کو اپنے تلامذہ، آنے والی نسلوں اور اس علم کے متلاشیوں کو دیانت داری کے ساتھ بہترین طریقے سے منتقل کریں۔ مجموعی طور پر علوم اسی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں اس فرض میں کوتاہی ہوتی ہے اور جس دور میں اجتماعی طور پر اس بنیادی کام سے پہلوتہی کی جاتی ہے، وہ جگہ اور دور تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ عظیم الشان ذخیرہ علوم وفنون اور عظمت تہذیب وتمدن کے بانی ومحسن وہی بے لوث اور پُرخلوص مشعل بردار تھے جنہوں نے اپنے علم وتجربے کو آگے منتقل کیا۔ بے شک جاننے والے نہ جاننے والوں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اس جاننے کے عمل کو جاری رکھنے اور شعور وآگہی کی دولت کو منتقل کرنے میں جن کا خون پسینہ ایک ہوتا ہے اور جن کی راتوں کی نیندیں اور دنوں کا چین اس مقدس فریضہ کی نظر ہو جاتا ہے، اُن کی شان ہی کچھ اور ہے۔ وہی لوگ یقیناً معلمین ہیں، جو انسانیت کے محسن، حال کے رہبر اور ماضی کے درخشاں روایات کے امین ہوتے ہیں۔ اُنہیں زندگی میں مادی اور اخلاقی اجر ملے نہ ملے لیکن اُن کی روشن مشعلیں انسانی راہوں کو منور کرتی رہتی ہیں اور یوں اُن کا نام لوحِ حیات پر نقشِ دوام بن جاتا ہے۔ ماضی کے ان درخشاں مشعلوں اور لوحِ حیات پر نقشِ دوام بننے والی ایک شخصیت امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ کی بھی ہے جنہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الجامع الصحیح للبخاری'' میں کتاب العلم کے تحت احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں اپنا تعلیمی نظریہ پیش کیا جس کی افادیت پر آج ۱۲۰۰ سال بعد جدید دور کے ماہرینِ تعلیم متفق نظر آتے ہیں۔

تعلیم کا مفہوم: لفظ ''تعلیم'' علم سے ماخوذ ہے۔ تعلیم کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کے بارے میں بار بار اور کثرت سے خبر دینا تاکہ سننے والے کے ذہن میں وہ بات پوری طرح بیٹھ جائے۔ یعنی طالب علموں کو ایسی تعلیم

* yasirahmad777@gmail.com

دی جائے کہ ان کی جملہ صلاحیتوں کی مناسب نشو ونما ہو سکے۔ چونکہ تعلیم کا انحصار فرد کے فلسفۂ حیات پر ہوتا ہے اسی لیے ہر مفکر نے تعلیم کی تعریف اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے۔ ان میں چند کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

امام الحرمینؒ اور ابن العربی مالکیؒ: امام الحرمینؒ اور ابن العربی مالکیؒ کے ہاں تعریفِ علم میں توقف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کی جامع اور مانع تعریف متعسر مشکل ہے۔ یہی رائے امام فخر الدین رازیؒ کی بھی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ علم، جہل کی ضد ہے اور اجلی البدیہیات سے ہے اور اجلی البدیہیات کی تعریف نہیں ہوتی۔

ماتریدیہ کے نزدیک: "صفة مودعة فی القلب کالقوة الباصرة فی العین" کا نام علم ہے، یعنی آنکھ کی روشنی کی طرح دلی روشنی کا نام علم ہے۔

فلاسفہ کے نزدیک: "حصول صورة الشیء بالصورة الحاصلة من الشیء عند العقل" کا نام علم ہے، کیونکہ اُن کے ہاں علم کا تعلق صرف موجودات سے ہے۔ جب کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے ہاں علم کا تعلق موجودات اور معدومات دونوں کے ساتھ ہے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک: تعلیم وتربیت کے تذکرے میں امام غزالیؒ کا نام صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ امام صاحب ایک ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ ماہر نفسیات بھی تھے۔ آپؒ کے خیال میں تعلیم اسلامی معاشرے کے بالغ ارکان کی جدوجہد ہے۔ جس سے آنے والی نسلوں کی نشو ونما اور تشکیلِ زندگی اُن کے نصب العین کے مطابق ہوتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک: یونانی فلاسفہ اور افلاطون (Plato) کے نزدیک تعلیم "حقیقت کی تلاش" ہے، جو نیکی کی طرف انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثالی معاشرے اور مملکت کی تعمیر کا واحد ذریعہ تعلیم ہی ہے۔

پستالوزی کے نزدیک: ماہر نفسیات پستالوزی (Pestalozzi) کے نزدیک تعلیم فرد کی جسمانی، اخلاقی اور ذہنی قوتوں کی متوازن نشو ونما کا نام ہے۔

ڈاکٹر جان ڈیوی کے نزدیک: مشہور ومعروف فلسفی اور ماہر ڈاکٹر جان ڈیوی (John Dewy) نے تعلیم کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "تعلیم بچے کے تجربات کی تعمیرِ نو، تجدیدِ نو اور تنظیمِ نو کا نام ہے"۔

ارسطو کے نزدیک: ارسطو کے نزدیک تعلیم کا مفہوم ایک نئے آدمی کی تعمیر ہے۔ تعلیم وہ عمل ہے جس سے معاشرے میں اتحاد اور عمدہ اخلاق پیدا کیے جاتے ہیں۔

روسو کے نزدیک: فرانسیسی مفکر "روسو" کے مطابق تعلیم فطری ماحول میں فرد کی انفرادیت کی نشو ونما کا نام ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم معاشرے کے پسندیدہ رسم ورواج، اقدار اور طرزِ حیات کو آئندہ نسل تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور کچھ کے نزدیک تعلیم کا مطلب ترقی پذیر اور بدلتا ہوا معاشرہ پیدا کرنا ہے اور مزید کچھ ماہرین ان دونوں مفاہیم کو ملا کر ایک مجموعی سی تعریف کرتے ہیں۔ جس کے مطابق تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے

جس سے معاشرہ کی بقا اور ارتقا دونوں مقصود ہیں۔

تعلیم کا اسلامی مفہوم: تعلیم کی اہمیت پر جتنا زور اسلام نے دیا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم ہی وہ جوہر ہے جو انسان اور حیوان میں امتیاز کا باعث ہے۔ تعلیم انسان پر ایسے اثرات اور نقوش چھوڑتی ہے، جو کبھی مٹ نہیں سکتے۔ تعلیم ہی انسانی شخصیت کو جان بخشتی ہے اور فرد کو اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

قرآنِ کریم میں خداوندِ کریم کا ارشاد ہے ﴿یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت﴾ یعنی جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔

اس آیتِ ربانی سے علم کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کو عظمت و بزرگی تعلیم ہی سے حاصل ہوتی ہے اور جس کو اللہ کی طرف سے عظمت و بزرگی مل جائے، اسے کسی اور شے کی خواہش نہیں رہتی۔ قرآنِ کریم میں تعلیم کی اہمیت اور عظمت کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ حصولِ علم کو نیکی کے مترادف مانا گیا ہے جس سے انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا درجہ ملتا ہے۔

اسلام میں تعلیم نہ صرف روحانی بالیدگی اور اخلاقی نشوونما کو فروغ دیتی ہے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے جس کا طالب علم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ تصورات، تہذیب و تمدن اور ثقافت بھی اس کے زیرِ اثر فروغ پاتی ہیں۔

اسلام کے نظریۂ تعلیم کے مطالعے سے مندرجہ ذیل اُصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

ا: خداوندِ کریم نے انسان کو بے داغ فطرت اور لامحدود صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان صلاحیتوں کو ترقی دینا اس کی اپنی پسند، ہمت اور استعداد پر منحصر ہے۔

ب: خداداد صلاحیتوں کو ترقی دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان نظامِ کائنات کی تخلیق اور اس کے اندازِ کار پر غور کرے۔

ج: تعلیم کے متحرک تصور کے لیے کوئی مقررہ نصاب مثالی اور ابدی نہیں ہوسکتا، نصاب میں لچک اور قوتِ جذب ہونی چاہیے۔

د: تمام انسان آپس میں بھائی ہیں، ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں، اگر فوقیت ہے تو علم سے ہے۔

اسلام نے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے علوم کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ اگر دینی اور دنیاوی علوم میں باہمی ربط و توازن ہوگا تو اسلامی نظریۂ تعلیم کا عروج ہوگا۔

خود امام بخاریؒ کے نزدیک وہ علم معتبر ہے جس سے ایمان میں ترقی ہو، چاہے وہ حیاتِ انسانی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو بشرطیکہ شریعت سے متصادم نہ ہو۔

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے وہ بلا امتیاز تعلیم کے حق کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے۔ جس میں رنگ و نسل، امیر و غریب، عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جب کہ تعلیم اس کا لازمی جزو ہے، جس کے بغیر دین کی حیثیت کو سمجھنا ناممکن ہے۔

تعلیم کی فضیلت: اگر استاد اور طالب علم کے ذہن میں تعلیم کی عظمت نہ ہو تو دونوں کا اس میدان میں چلنا نہایت مشکل ہے۔ اس میں دراصل طالب علم اور استاد دونوں کو جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے اندر علم کے حصول کا ایک جذبہ ہو۔ تو استاد اور شاگرد کے ذہن میں علم کی فضیلت بٹھانے کے لیے امام بخاریؒ نے ﴿باب العلم قبل القول و العمل﴾ کے عنوان سے باب قائم کیا جس کے تحت ۱۲ نکتے ذکر فرمارہے ہیں۔

۱: ایمان اس وقت لاؤ گے جب علم ہو، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو کسی چیز کے بارے میں علم ہو تو ایمان لاؤ گے۔ اگر ایک طرف ﴿انا اعلمکم باللہ﴾ میں یہ بیان ہوا کہ علم وہ قابل قبول ہے جو ایمان کا نتیجہ ہو تو دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ علم کے لیے ایمان موقوف علیہ ہے۔

۲: علم سبب وراثتِ نبوی ﷺ ہے۔ علم سے بنیادی طور پر مراد اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا ادراک کرنا ہے۔ قرآن وحدیث کے پڑھنے سے مرضیاتِ ربانی کا ادراک ہوگا۔ معرفتِ ربانی جیسے بھی حاصل ہو، پیغمبر ﷺ کا وارث کہلائے گا۔

۳: علم ذریعۂ دخولِ جنت ہے۔ چونکہ صاحب علم اللہ تعالیٰ کی مرضیات جانتا ہے، اسی وجہ سے اسی کے مطابق اپنی زندگی بنا کر جنت میں داخل ہوگا۔

۴: علم ذریعۂ خشیتِ الٰہی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے ﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء﴾ لہٰذا مرضیاتِ ربانی کے جاننے کی وجہ سے صاحب علم اپنے آپکو ان امور کے ارتکاب سے بچائے گا جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہو۔

۵: علم عقل مندی کی نشانی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے ﴿وما یعقلھا الا العالمون﴾

۶: علم جہنم سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے ﴿وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر﴾

۷: علم کے کوئی چیز مساوی نہیں۔ ﴿ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾

۸: علم اللہ کے ارادۂ خیر کی نشانی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین﴾

۹: علم کے لیے استاد کا ہونا ضروری ہے۔ ﴿وانما العلم بالتعلم﴾

۱۰: علم زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے جیسے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا﴿لو وضعتم الصمصامة علی هذه وظننت انی انفذ کلمة﴾

۱۱: علم ذریعۂ تبلیغ ہے ﴿لیبلغ الشاهد الغائب﴾

۱۲: علم سے حکمت سیکھی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿کونوا ربانیین﴾ ای حکماء علماء فقهاء۔ اسی وجہ سے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ علم حکمت اور فقاہت کا مجموعہ ہے۔

امام بخاریؒ کے ان ۱۲ نکتوں سے واضح ہو رہا ہے کہ استاد کو اپنے پیشے اور منصب سے وفادار ہونا چاہیے۔

تعلیم کی ضرورت: ابتدائی دور میں انسان تنہا رہتا تھا۔ تنہا رہ کر وہ ماحول کو قابو میں نہ لا سکتا تھا۔ ماحول کی مخالف قوتیں بڑی زور آور اور ظالم تھیں۔ اس کی مخالفت سے بچنے کے لیے تنہا انسان کافی نہ تھا۔ فطرت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ علیحدہ زندگی گزارنے والے انسان اگر یکجا ہو جائیں تو وہ با آسانی ان مخالف قوتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس ضرورت کے تحت بے ترتیب اور غیر منظم انسان ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اس قربت نے باہمی تعلقات، تنظیم، نظم و ضبط اور ایسے دیگر کئی مسائل پیدا کر دیئے جس کی وجہ سے انسان خیالات، افکار، نظریات اور ابلاغ و اظہار میں ہم آہنگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے انہوں نے مختلف طریقے، اشیا، مہارتیں، معلومات، قاعدے، قوانین اور رہن سہن کے انداز اختیار کیے۔ ان کے صحیح اور پُر اثر استعمال کی دیکھ بھال کے لیے ادارے قائم کیے اور یوں ایک ثقافت وجود میں آئی۔ ہر نسل اسی ثقافت کو بہتر صورت میں نئی نسل تک منتقل کرتی رہی۔ یہ انتقال ثقافت کے ذریعے ہی ممکن ہوا۔ لہٰذا انسان نے اپنے معاشرے کی ثقافت کو منتقل کرنے کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جو تعلیم کا فریضہ ادا کر سکیں۔ اس ادارے کی ابتدا گھر سے ہوئی جہاں ماں باپ کی حیثیت معلم کی تھی۔ لیکن معاشرتی پیچیدگی نے انسان کو نئے ادارے قائم کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح تعلیم کے باقاعدہ رسمی ادارے قائم ہو گئے اور تعلیم ایک معاشرتی ذمہ داری بن گئی۔

تعلیم کا مقصد: حقیقت یہ ہے کہ مقاصدِ تعلیم قوم کے نقطۂ حیات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک فلسفۂ حیات ہوتا ہے، کیونکہ تعلیم ہی وہ ذریعہ یا آلہ ہے جس کے ذریعے قوم اپنی نئی نسل کو اپنے فلسفۂ حیات سے روشناس کراتی اور انھیں بامقصد زندگی گزارنے کے اہل بناتی ہے۔ چنانچہ ہر مفکر نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

سقراط کی رائے: سقراط کے خیال میں تعلیم کا مقصد نیک افراد پیدا کرنا ہے۔

افلاطون کی رائے: افلاطون کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد فرد اور معاشرہ میں توازن برقرار رکھنا ہے۔

ارسطو کی رائے: ارسطو کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد زندگی میں مسرت و شادمانی حاصل کرنا ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس کے حقوق و فرائض سے آگاہ کر دیا جائے۔

امام غزالیؒ کی رائے: امام غزالیؒ کے خیال میں تعلیم کا مقصد سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کرنا ہے۔

مختصراً یہ کہ تعلیم کے مقاصد زمانے اور وقت کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کا مقصد: قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کا مقصد انسان کو انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف کرنا ہے۔ اس میں حق پرستی، انصاف پسندی، مساوات کا جذبہ، بہادری، بے خوفی، محبتِ الٰہی، عبادت کا شوق، نیکی کا تأثر قبول کرنے کی اہلیت اور عام زندگی کی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔ تعلیم کا مقصد اس کے ذہن کو اس طرح جلا بخشنا ہے کہ وہ ظلم اور زیادتی، بے انصافی اور عدمِ مساوات، استحصال اور جبر سے فطری طور پر نفرت کر سکے اور معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کو سب سے بڑی سعادت خیال کرے۔

تعلیم و تدریس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن سچائیوں کا درس ہم اپنی نوخیز نسل کو دینا چاہتے ہیں، بڑی نسل اس کی عملی تصویر ہو اور سچائیوں پر کاربند ہو۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو نظریات اساتذہ کی محض زبانوں پر رہیں اور بالغ مردوں اور عورتوں کے کردار ان کی حقیقی عکاسی نہ کر سکیں، وہ نئی نسل کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، خواہ ان کی تدریس صبح سے شام تک جاری رہے۔ ہمارا کردار ہمارے اصولوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قول اور فعل کا تضاد نئی نسل کی ذہنی و جذباتی صحت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔

مندرجہ بالا ابحاث کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے قدیم اور جدید نظریات کو سمجھا جائے۔ اگرچہ کوئی حدِ فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی کہ قدیم نظریہ کس دور اور عہد تک مقبول رہا ہے اور جدید مفہوم کب رائج ہوا۔ آج بھی بہت سے معاشرے قدیم نظریۂ تعلیم کو درست سمجھتے ہیں اور کئی قدیم ماہرین اور معاشرے بھی آج کے ترقی یافتہ نظریۂ تعلیم کے قریب تر تھے۔

قدیم نظریۂ تعلیم: قدیم نظریۂ تعلیم میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ طالب علموں کی ضروریات اور احساسات کی بجائے استاد کے نظریات کو اولیت حاصل تھی۔ تعلیمی اداروں میں ڈسپلن سخت تھا۔ زیادہ سے زیادہ اخلاقی تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ نصابِ تعلیم بچوں کی ضروریات کی بجائے استاد کی تجویز کی ہوئی کتب پر مشتمل ہوتا تھا۔ طالب علموں کو جن مضامین کا درس دیا جاتا تھا وہ ان کے نفسیاتی تقاضوں، عمر اور استعداد سے عموماً بے تعلق ہوتا تھا۔ سارا زور ذہنی بالیدگی پر ہوتا تھا۔ کسی مضمون کو یاد کر کے اس پر عبور حاصل کرنا تعلیم کہلاتا تھا۔ بچے کو ایک ہی وقت میں کئی کئی ایسے مضامین کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا جن کا ان کی زندگی یا قریبی ماحول سے واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم دینے کا کام زیادہ تر مذہبی لوگ سرانجام دیتے تھے اور یہ تعلیم صرف امراء کے بچوں کے لیے مخصوص ہوتی تھی، باقی عوام اور خصوصاً عورتیں تعلیم سے محروم رہتی تھیں۔ بچے کی قابلیت کا معیار اس کی یادداشت اور قوتِ حافظہ پر ہوتا تھا۔

قدیم نظامِ تعلیم میں طریقۂ تدریس: قدیم نظامِ تعلیم میں طرقِ تدریس بھی ناقص تھے۔ استاد کا کام درس دینا اور شاگرد کا کام درس سننا ہوتا تھا۔ معلم ہی ہر چیز میں پیش پیش ہوتا تھا، یعنی تعلیم، نظامِ تعلیم، نصاب اور فلسفہ سب کچھ معلم ہی ہوتا تھا۔ معلم اپنے اسباق میں امدادی اشیا کا استعمال نہ کرتا تھا، صرف زبانی درس پر زور ہوتا تھا۔ بچوں کی دل چسپیوں یا ان کے احساسات اور جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اساتذہ کی تربیت کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ جو کوئی دوسرا کام نہ کر سکتا تھا، وہ عام طور پر معلمی کا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔

معلم کی تربیت: امام بخاریؒ معلم کی تربیت کے واسطے دو باب ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ﴿باب قول اللہ تعالیٰ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾ یعنی استاد کو چاہیے کہ اپنا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں معمولی سمجھے، اگر کمی کا احساس ہو تو سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اسی طرح ﴿باب ما یستحب للعالم اذا سئل ایّ الناس اعلم فیکل العلم الی اللہ تعالیٰ﴾ سے بتلانا چاہتے ہیں کہ بہترین استاد کی خوبی یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ کی ذات کو سمجھے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ اسی طرح استاد اور شاگرد دونوں کے درمیان قرب آجائے گا تو دونوں کو فائدہ ہوگا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ استاد کو جو مسئلہ نہیں آتا، وہ غلط نہیں بتائے گا بلکہ پوچھے گا، مطالعہ کرے گا۔ یہ بہترین استاد کی ایک اضافی خوبی ہے۔

معلم کی ذمہ داریاں: تعلیم وتدریس ایک ایسا شعبہ ہے جس میں معلم نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اس کی کارکردگی پر اس کے طالب علموں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے، طلبہ کی فطرت کو تبدیل کر سکتا ہے اور انھیں اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ معلم کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کے ساتھ ہمیشہ صاف ستھرا، باوقار اور شائستہ لباس پہننے کا عادی ہونا چاہیے۔ چونکہ معلم کی عادات واطوار پر طلبہ کی خاص نظر رہتی ہے، وہ ان کے اندازِ بیاں، طرزِ کلام، چال چلن، اندازِ نشست وبرخاست پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اس لیے معلمین حضرات اپنے اندر ایسی عادات واطوار پیدا کریں جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہوں اور انھیں تمسخر کا نشانہ نہ بنایا جا سکے۔ چونکہ تعلیم کے میدان میں معلم کو ایک ماہر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے اس اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لیے ایک اچھے معلم پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

۱: استاد کے لیے پڑھاتے وقت ضروری ہے کہ خود بھی نشاط میں ہو اور اس کے ساتھ ساتھ متعلم کی نشاط کا بھی خیال رکھے اور اسے چاہیے کہ ایسے اوقات میں پڑھائے کہ پڑھنے کے لیے دل میں شوق اور نشاط ہو اور تنفر اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ﴿باب ما کان النبی ﷺ یتخولھم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا﴾

۲: معلم کو چاہیے کہ دورانِ تدریس کسی شاگرد کے غیر متعلقہ سوال سے جواب آخر میں دے تاکہ دورانِ

سبق غیر متعلقہ باتوں سے درس میں خلل واقع نہ ہو اور ذہن منتشر ہو کر اصل مقصود فوت نہ ہو جائے۔
اسی طرح اگر سوال مناسب بھی ہو لیکن معلم جواب کو مؤخر کر کے درس کے آخر میں جواب دے، تو یہ بھی جائز ہے۔
اسکی طرف اشارہ امام بخاریؒ کی پیش کردہ حدیث سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مجلس میں باتیں کر رہے تھے، اسی دوران ایک اعرابی صحابیؓ نے قیامت کے وقوع کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے فارغ ہو کر جواب دیا۔

۳: اچھے مدرس کی خوبی یہ ہے کہ اس کا درس طلبا کے تینوں طبقوں یعنی فہمی، متوسط اور ذہین کے معیار کے مطابق ہو، تاکہ کسی ایک طبقے کے طالب علم کو سمجھنے میں دقت نہ ہو اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ﴿باب الفهم فی العلم﴾ کے عنوان سے ترجمۃ الباب قائم کر کے واضح کیا کہ لوگ فہم فی العلم میں مختلف ہوتے ہیں لہٰذا استاد کو سب کی رعایت کرنی چاہیے۔

۴: دورانِ درس اگر طالب علم کوئی ایسا سوال کر لے جو استاد کو برا لگے تو استاد اسے ڈانٹنے کی بجائے تحمل سے کام لے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرے جیسے کہ اس اعرابی صحابیؓ کے غیر متعلقہ سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے عملی طور پر نرمی کے برتاؤ کا ثبوت دے دیا۔

۵: سوال و جواب کے دوران استاد مسئولہ مسئلہ کے علاوہ اس کے مناسب اور مسائل بھی بیان کرے تاکہ طالب علم تشویش کا شکار نہ ہو جیسے کہ نبی کریم ﷺ سے سمندر کے پانی سے وضو کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ﴿هو الطهور ماءه والحل میتته﴾

۶: معلم کے شاگرد اتنے ہونے چاہیے کہ وہ آسانی سے معلم کی آواز سن سکیں اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ﴿باب من رفع صوته بالعلم﴾ کے عنوان سے ترجمۃ الباب قائم کیا۔ تعلیمی سوچ کے مطابق یہ بات وسائل پر مبنی ہے کہ زیادہ طلبہ کی نسبت کم طلبہ کی تربیت آسان ہوتی ہے۔ اگر ایک جماعت میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو تو آواز پہنچانے کے لیے معلم لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا استعمال کر سکتا ہے تاہم کلاس اور جماعت پر دسترس حاصل کرنا معلم کے لیے ایک ضروری امر ہے۔

۷: مدرس کو طالب علم کے ساتھ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے، یعنی اس کے درس میں جلال کی بجائے جمال ہونا چاہئے تاکہ طالب علم سوال پوچھنے میں حرج محسوس نہ کرے جیسے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب طالب علم تمہارے پاس آئے تو ﴿فقولوا لهم مرحبا﴾

۸: معلم تعلیم کے لیے ایام کی تخصیص کر سکتا ہے، ایسا کرنا بدعت کے قبیل سے نہیں ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ﴿باب من جعل لاهل العلم ایاما معلومة﴾ (بقیہ صفحہ ۴۱ پر)